دوسرا حصہ

مرزا کے کلام پر ریویو اور اُسکا انتخاب

مرزا کے کلام پر ریویو کرنا، اور اُسکی حقیقت لوگوں کے ذہن نشین کرنی۔ ایک ایسے زمانے میں جبکہ فارسی زبان ہندوستان میں بمنزلہ مُردہ زبان کے ہوگئی ہے اور ذوقِ شعر روز بروز کافور ہوتا جاتا ہے۔ ایک نہایت مشکل کام ہے مرزا کے کلام میں جو چیز سب سے زیادہ گراں قدر ہے وہ اُنکی فارسی نظم و نثر ہے۔ لیکن اوّل تو فارسی زبان سے مُلک میں عام اجنبیت پائی جاتی ہے؛ دوسرے مرزا کے کلام میں بعض خصوصیتیں ایسی ہیں جن سے لوگوں کے مذاق بالکل نا آشنا ہیں۔ پس جو شخص اِس زمانے میں اُن کے کلام پر ریویو کرنا، اور اُسکے ذریعے سے مصنّف کی حقیقت اور اُسکا رتبہ پبلک پر ظاہر کرنا چاہتا ہے وہ درحقیقت ایک ایسے کام کے درپے ہے جسمیں کامیابی کی بہت ہی کم امید ہوسکتی ہے۔ لیکن اگر کچھ امید ہے تو اُسی صورت میں ہے کہ کچھ کیا جاے؛ نہ یہ کہ کام کی مشکلات پر نظر کرکے اُس سے ہاتھ اُٹھا لیا جاے۔

دفعِ غم نیست جز بغم خوردن　　　چارۂ کار نیست جز کردن

مرزا کی شاعری اکتسابی نہ تھی بلکہ اُنکی حالت پر غور کرنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ملکہ اُن کی فطرت میں ودیعت کیا گیا تھا۔ اُنھوں نے۔ جیسا کہ اپنے فارسی دیوان کے خاتمے میں تصریح کی ہے۔ گیارہ[1] برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کردیا تھا۔ اُسی زمانے میں اُنھوں نے فارسی میں کچھ اشعار بطور غزل کے موزوں کئے تھے؛ جنکی ردیف میں کہ چہ بجاے یعنی چہ کے استعمال کیا تھا۔ جب اُنھوں نے وہ اشعار اپنے اُستاد شیخ معظم کو سُنائے تو اُنھوں نے کہا کہ یہ کیا مہمل ردیف اختیار کی ہے؟ ایسے بے معنی شعر کہنے سے کچھ فائدہ نہیں۔ مرزا یہ سُنکر خاموش ہو رہے۔ ایک روز مُلّا ظہوری کے کلام میں ایک شعر اُنکی نظر پڑ گیا جسکے آخر میں لفظِ کہ چہ یعنی چہ کے معنی میں آیا تھا۔ وہ کتاب لے کر دوڑے ہوئے اُستاد پاس گئے اور وہ شعر دکھایا شیخ معظم اُسکو دیکھکر حیران ہوگئے؛ اور مرزا سے کہا تمکو فارسی زبان سے خداداد مناسبت ہے؛ تم ضرور فکرِ شعر کیا کرو؛ اور کسی کے اعتراض کی کچھ پروا نہ کرو۔

مرزا کو جیسا کہ پہلے ذکر ہوچکا ہے باپ نے پانچ برس کی اور چچا نے نو برس کی عمر میں چھوڑا تھا۔ چچا کے بعد کوئی مربّی و سرپرست اُنکے سر پر نہ رہا تھا۔ مرزا کی ننھیال جہاں اُنھوں نے

[1] منشی بہاری لال مشتاق کا بیان ہے کہ لالہ کنھیا لال ایک صاحب آگرہ کے رہنے والے جو مرزا صاحب کے ہمعصر تھے ایکبار دلّی میں آئے اور جب مرزا صاحب سے ملے تو اثناے کلام میں اُنکو یاد دلایا کہ جو مثنوی آپ نے پتنگ بازی کے زمانے میں لکھی تھی وہ بھی آپکو یاد ہے؟ اُنھوں نے انکار کیا لالہ صاحب نے کہا وہ اُردو مثنوی میرے پاس موجود ہے چنانچہ اُنھوں نے وہ مثنوی مرزا کو لا کر دی اور وہ اُسکو دیکھکر بہت خوش ہوئے اُسکے آخر میں یہ فارسی شعر کسی اُستاد کا پتنگ کی زبان سے لاحق کر دیا تھا۔ "رشتۂ درگردنم افگندہ دوست ؎ می کشد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست"۔ لالہ صاحب کا بیان تھا کہ مرزا صاحب کی عمر جبکہ یہ مثنوی لکھی تھی آٹھ نو برس کی تھی۔"

پرورش پائی تھی بہت آسودہ حال تھی اور ننھیال کی ثروت سے ظاہرا مرزا اور اُنکے بھائی سے بڑھکر کوئی فائدہ اُٹھانے والا نہ تھا۔ آغازِ شباب میں جبکہ سر پر کوئی مربی نہو۔ دولت و آسودگی سے زیادہ کوئی چیز خانہ برانداز نہیں ہوسکتی۔ مرزا کی نوجوانی کے ساتھ اُس آسودگی نے وہ کام کیا جو آگ بارود کے ساتھ کرتی ہے جس آزادی اور مطلق العنانی میں مرزا کی جوانی گذری ہے اُسکی کیفیت کا خود اُنھیں کے الفاظ سے اندازہ ہوسکتا ہے۔ وہ ایک جگہ اپنی جوانی کی حالت اِس طرح ظاہر کرتے ہیں "باخرد و فرہنگ بیگانہ، و با نام و ننگ دشمن، با فرومایگان ہمنشیں، و با اوباش ہمرنگ، پاے بیراہہ پوے، و زباں بے ہرزہ گوے، در شکستِ خویش گردوں را دستیار، و در آزارِ خویش دشمن را آموزگار،" اِسکے بعد لکھتے ہیں "تیزی رفتارِ من از مسجد و بتخانہ گرد انگیخت، و خانقاہ و میکدہ را بیکدگر زد،" الغرض مرزا کا لڑکپن اور اُنکی جوانی ایسی حالت میں بسر ہوئی تھی کہ ایک ایسے فن میں جسکا نہ کوئی قدرداں نظر آتا تھا اور نہ کوئی خریدار دکھائی دیتا تھا، اعلےٰ درجے کا کمال بہم پہونچانا تو درکنار؛ اُس کا خیال بھی دل میں گذرنا قریب ناممکن کے تھا۔ پس یہ صرف اُنکی طبیعی مناسبت اور فطری قابلیت کا اقتضا تھا کہ اُس غفلت و بدمستی کے عالم میں بھی شعر کا کھٹکا برابر لگا رہا اور شاعری کی تکمیل کا خیال ایسی بے خبری کے زمانے میں بھی فراموش نہیں ہوا۔

مرزا نے گلِ رعنا[1] کے دیباچے میں لکھا ہے کہ میں نے اول اُردو زبان میں شعر کہنا شروع کیا تھا اس لئے ہم بھی پہلے اُنکے اُردو دیوان کا ذکر کرتے ہیں جس روش پر مرزا نے ابتدا میں اُردو شعر

[1] مرزا نے اپنے کلکتے کے ایک دوست مولوی سراج احمد کی فرمایش سے اپنے تمام اُردو اور فارسی دیوان کا انتخاب کیا تھا جس کا دیباچہ اُنکے کلیات نثر فارسی میں موجود ہے اُسکا نام گلِ رعنا رکھا تھا۔

کہنا شروع کیا تھا قطع نظر اِسکے کہ اُس زمانے کا کلام خود ہمارے پاس موجود ہے۔ اُس روش کا اندازہ اِس حکایت سے بخوبی ہوتا ہے۔ خود مرزا کی زبانی سُنا گیا ہے کہ میر تقی[†] نے جو مرزا کے ہم وطن تھے اُنکے لڑکپن کے اشعار سُنکر یہ کہا تھا کہ "اگر اِس لڑکے کو کوئی کامل اُستاد مل گیا اور اُسنے اِسکو سیدھے رستے پر ڈالدیا تو لاجواب شاعر بنجائیگا؛ ورنہ مہمل بکنے لگے گا"

مرزا کے ابتدائی اشعار دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ تو طبیعت کی مناسبت سے اور زیادہ تر مُلا عبد الصمد کی تعلیم کے سبب۔ فارسیت کا رنگ ابتدا ہی میں مرزا کے بول چال اور اُنکی قوتِ متخیلہ پر چڑھ گیا تھا۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اکثر ذکی الطبع لڑکے ابتدا میں سیدھے سادے اشعار کی نسبت مشکل اور پیچیدہ اشعار کو جو بغیر غور و فکر کے آسانی سے سمجھ میں نہیں آتے زیادہ شوق سے دیکھتے اور پڑھتے ہیں۔ مرزا نے لڑکپن میں بیدل کا کلام زیادہ دیکھا تھا چنانچہ جو روش مرزا بیدل نے فارسی زبان میں اختراع کی تھی اُسی روش پر مرزا نے اُردو میں چلنا اختیار کیا تھا جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں۔

"طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا اسد اللہ خاں قیامت ہے"

یہاں بطور نمونہ کے مرزا کے ابتدائی کلام میں سے چند اشعار لکھے جاتے ہیں۔

(۱) کرے* گر فکرِ تعمیرِ خرابیہاے دل گردوں نہ نکلے خشت مثلِ استخواں بیروں قالبہا

[†] مرزا کی ولادت ۱۲۱۲ھ میں ہوئی ہے اور میر کی وفات ۱۲۲۵ھ میں واقع ہوئی اِس سے ظاہر ہے کہ مرزا کی عمر میر کی وفات کے وقت تیرہ چودہ برس کی تھی۔ مرزا کے اشعار اُنکے بچپن کے دوست نواب حسام الدین حیدر خاں مرحوم والد ناظر حسین مرزا صاحب نے میر تقی کو دکھائے تھے۔

* یہ شعر مرزا نے اپنے دیوانِ ریختہ میں سے تو نکال ڈالا مگر دیوانِ فارسی میں بتغیرِ الفاظ داخل کر دیا یعنی اِس طرح "کند گر فکرِ تعمیرِ خرابیہاے ما گردوں ÷ نیاید خشت مثلِ استخواں بیروں ز قالب ہا"

(۲) اسد ہر اشک ہے اک حلقہ بر زنجیر افزودن | بہ بندِ گریہ ہے نقش بر آب امید رستن ہا

(۳) بحسرت گاہِ نازِ کشتۂ جاں بخشیِ خوباں | خضر کو چشمۂ آبِ بقا سے ترجبیں پایا

(۴) رکھا غفلت نے دور افتادۂ ذوقِ فنا ورنہ | اشارت فہم کو ہر ناخنِ بریدہ ابرو تھا

(۵) پریشانی سے مغزِ سر ہوا ہے پنبۂ بالش | خیالِ شوخیِ خوباں کو راحت آفریں پایا

(۶) موسمِ گل میں مئے گلگوں حلالِ میکشاں | عقدِ وصلِ دختِ رز انگور کا ہر دانہ تھا

(۷) ساتھ جنبش کے بیک برخاستن طے ہو گیا | گو کیا صحرا غبارِ دامنِ دیوانہ تھا

چونکہ مذکورۂ بالا شعروں میں قطع نظر اسکے کہ طرز بیان اردو بول چال کے خلاف ہے۔ خیالات میں بھی کوئی لطافت نہیں معلوم ہوتی؛ اس لئے ان کے معنی بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف چوتھے شعر کی جو کسی قدر آسان ہے یہاں بطور نمونے کے شرح کیجاتی ہے؛ تاکہ معلوم ہو کہ مرزا نے مشقِ سخن کس قسم کے خیالات سے شروع کی تھی اور کس قدر کاوش سے وہ نئی قسم کے مضمون پیدا کرتے تھے۔

کہتا ہے کہ فنا میں جو لذت اور ذوق تھا ہماری غفلت نے اس سے ہمیشہ دور دور رکھا۔ اگر یہ غفلت نہ ہوتی تو اشارت فہم کے لئے ہر ایک ناخن۔ جو کاٹ کر پھینک دیا جاتا ہے۔ ابرو کا کام دیتا تھا۔ ابرو کا کام ہے اشارہ و ایما کرنا؛ اور ناخنِ بریدہ جو ابرو کی شکل ہوتا ہے وہ بھی فنا کی لذت کی طرف اشارہ کرتا تھا؛ کیونکہ ناخن کے کٹنے سے جو ایک قسم کی فنا ہے لذت اور راحت حاصل ہوتی ہے۔

یہ اوپر کی سات بیتیں ہمنے مرزا کے ان نظری اشعار اور نظری غزلوں میں سے نقل کی ہیں جو انھوں نے اپنے دیوانِ ریختہ کو انتخاب کرتے وقت اسمیں سے نکال ڈالی تھیں۔ مگر اب بھی

ان کے دیوان میں ایک ثلث کے قریب بہت سے اشعار ایسے پائے جاتے ہیں جن پر اردو زبان کا اطلاق مشکل سے ہو سکتا ہے۔ جیسے ذیل کے اشعار جو اب دیوان میں موجود ہیں۔

شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا | تماشائے بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا

ہوائے سیرِ گل آئینۂ بے مہریِ قاتل | کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنائے نشاط | تو ہو اور آپ بصد رنگ گلستاں ہونا

شب خمارِ چشمِ ساقی رستخیز اندازہ تھا | تا محیطِ بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا

یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا | جادہ اجزائے دو عالم دشت، کا شیرازہ تھا

ان اشعار کو مہمل کہو یا بے معنی مگر اسمیں شک نہیں کہ مرزا نے وہ نہایت جانکاہی اور جگر کاوی سے سرانجام کئے ہونگے۔ جب کہ اپنے معمولی اشعار کاٹتے ہوئے لوگوں کا دل دکھتا ہے تو مرزا کا دل اپنے اشعار نظری کرتے ہوئے کیوں نہ دکھا ہوگا؟ ظاہرا یہی سبب تھا کہ انتخاب کے وقت بہت سے اشعار۔ جو فی الواقع نظری کرنے کے قابل تھے۔ انکے کاٹنے پر مرزا کا قلم نہ اٹھ سکا۔ ممکن ہے کہ ایک مدت کے بعد یہ اشعار انکی نظر میں کھٹکے ہوں؛ مگر چونکہ دیوان چھپکر شائع ہو چکا تھا اس لئے انھوں نے ان اشعار کا نکالنا فضول سمجھا۔

مرزا کے حق میں جو پیشین گوئی میر تقی نے کی تھی اسکی دونوں شقیں انکے حق میں پوری ہوئیں؛ ظاہر ہے کہ مرزا اول اول ایسے رستے پر پڑ لئے تھے کہ اگر استقامتِ طبع، اور سلامتِ ذہن، اور بعض صحیح المذاق دوستوں کی روک ٹوک، اور نکتہ چین ہمعصروں کی خردہ گیری اور طعن و تعریض سدِ راہ نہ ہوتی تو وہ شدہ شدہ منزلِ مقصود سے بہت دور جا پڑتے۔ سنا گیا ہے کہ اہلِ دہلی مشاعروں

میں۔ جہاں مرزا بھی ہوتے تھے۔ تعریضاً ایسی غزلیں لکھکر لاتے تھے جو الفاظ اور ترکیبوں کے لحاظ سے تو بہت پُرشوکت و شاندار معلوم ہوتی تھیں؛ مگر معنی ندارد؛ گویا مرزا پر یہ ظاہر کرتے تھے کہ آپ کا کلام ایسا ہوتا ہے۔

لطیفہ

ایک دفعہ مولوی عبدالقادر رام پوری نے۔ جو نہایت ظریف الطبع تھے۔ اور جنکو چند روز قلعۂ دہلی سے تعلق رہا تھا۔ مرزا سے کسی موقع پر یہ کہا کہ آپ کا ایک اردو شعر سمجھ میں نہیں آتا؛ اور اُسی وقت دو مصرعے خود موزوں کرکے مرزا کے سامنے پڑھے

"پہلے تو روغنِ گل بھینس کے انڈے سے نکال   پھر دوا جتنی ہے کل بھینس کے انڈے سے نکال"

مرزا سنکر سخت حیران ہوئے؛ اور کہا حاشا یہ میرا شعر نہیں۔ مولوی عبدالقادر نے ازراہِ مزاح کے کہا میں نے خود آپ کے دیوان میں دیکھا ہے؛ اور دیوان ہو تو میں اب دکھا سکتا ہوں۔ آخر مرزا کو معلوم ہوا کہ مجھپر اِس پیرائے میں اعتراض کرتے ہیں؛ اور گویا یہ جتاتے ہیں کہ تمھارے دیوان میں اِس قسم کے اشعار ہوتے ہیں۔

مرزا نے اِس قسم کی نکتہ چینیوں پر اُردو اور فارسی دیوان میں جابجا اشارہ کیا ہے۔ اُردو میں ایک جگہ کہتے ہیں

"نہ ستایش کی تمنا نہ صلے کی پروا   گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی"

ایک اور اُردو غزل کا مطلع ہے

"گر خامشی سے فائدہ اخفای حال ہے   خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے"

یعنی اگر خاموشی سے یہ فائدہ ہے کہ حالِ دل ظاہر نہیں ہوتا تو میں خوش ہوں کہ میرا بولنا بھی

خاموشی ہی کا فائدہ دیتا ہے؛ کیونکہ میرا کلام کسی کی سمجھ ہی میں نہیں آتا۔

چونکہ مرزا کی طبیعت فطرةً نہایت سلیم واقع ہوئی تھی اس لئے نکتہ چینوں کی تعریضوں سے اُنکو بہت تنبہ ہوتا تھا؛ اور آہستہ آہستہ اُن کی طبیعت راہ پر آتی جاتی تھی۔ اِسکے سوا جب مولوی **فضل حق** سے مرزا کی راہ و رسم بہت بڑھ گئی اور مرزا اُنکو اپنا خالص مخلص دوست اور خیرخواہ سمجھنے لگے تو اُنھوں نے اِس قسم کے اشعار پر بہت روک ٹوک کرنی شروع کی؛ یہاں تک کہ اُنھیں کی تحریک سے اُنھوں نے اپنے اُردو کلام میں سے جو اُس وقت موجود تھا دو ثلث کے قریب نکال ڈالا؛ اور اُسکے بعد اُس روش پر چلنا بالکل چھوڑ دیا۔

مرزا نے ریختہ میں جو روش ابتدا میں اختیار کی تھی ظاہر ہے کہ وہ کسی طرح مقبولِ خاص و عام نہیں ہوسکتی تھی۔ لوگ عموماً میر، سودا، میرحسن، جرأت اور انشا وغیرہ کا سیدھا سادہ اور صاف کلام سُننے کے عادی تھے۔ جو محاورے روزمرہ کی بول چال اور بات چیت میں برتے جاتے تھے اُنھیں کو جب اہلِ زبان وزن کے سانچے میں ڈھلا ہوا دیکھتے تھے تو اُنکو زیادہ لذت آتی تھی اور زیادہ لطف حاصل ہوتا تھا۔ شعر کی بڑی خوبی یہی سمجھی جاتی تھی کہ اِدھر قائل کے منہ سے نکلا اور اُدھر سامع کے دل میں اُتر گیا؛ مگر مرزا کے ابتدائی ریختے میں یہ بات بالکل نہ تھی۔ جیسے خیالات اجنبی تھے ویسی ہی زبان غیر مانوس تھی۔ فارسی زبان کے مصادر، فارسی کے حروفِ ربط اور توابع فعل۔ جو کہ فارسی کی خصوصیات میں سے ہیں۔ اُنکو مرزا اُردو میں عموماً استعمال کرتے تھے۔ اکثر اشعار ایسے ہوتے تھے کہ اگر اُن میں ایک لفظ بدل دیا جائے تو سارا شعر فارسی زبان کا ہوجائے۔ بعض اسلوب بیان خاص مرزا کے مخترعات میں سے تھے

جو نہ اُن سے پہلے اُردو میں دیکھے گئے نہ فارسی میں۔ مثلاً اُنکے موجودہ اُردو دیوان میں ایک شعر ہے

"قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ اے نالہ نشانِ جگر سوختہ کیا ہے"

میں نے خود اِس کے معنی مرزا سے پوچھے تھے فرمایا کہ اے کی جگہ جُز پڑھو؛ معنی خود سمجھ میں آجائیں گے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ قمری۔ جو ایک کفِ خاکستر سے زیادہ۔ اور بلبل۔ جو ایک قفسِ عنصری سے زیادہ نہیں۔ اُنکے جگر سوختہ یعنی عاشق ہونے کا ثبوت صرف اُنکے چہکنے اور بولنے سے ہوتا ہے۔ یہاں جس معنی میں مرزا نے اے کا لفظ استعمال کیا ہے ظاہر ایہ اُنھیں کا اختراع ہے ایک شخص نے یہ معنی سُنکر کہا کہ "اگر وہ اے کی جگہ جُز کا لفظ رکھدیتے یا دوسرا مصرعہ اِسطرح کہتے "اے نالہ نشاں تیرے سوا عشق کا کیا ہے"، تو مطلب صاف ہوجاتا"، اُس شخص کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے مگر مرزا چونکہ معمولی اسلوبوں سے تا بمقدور بچتے تھے اور شارع عام پر چلنا نہیں چاہتے تھے اِس لئے وہ بہ نسبت اِسکے کہ شعر عام فہم ہوجائے اِس بات کو زیادہ پسند کرتے تھے کہ طرزِ خیال اور طرزِ بیان میں جدت اور نرالا پن پایا جائے۔

مرزا کے ابتدائی کلام کو مہمل و بے معنی کہو یا اُسکو اُردو زبان کے دائرے سے خارج سمجھو مگر اِسمیں شک نہیں کہ اِس سے اُنکی اُرجینیلٹی اور غیر معمولی اُپج کا خاطر خواہ سُراغ ملتا ہے اور یہی اُنکی ٹیڑھی ترچھی چالیں اُنکی بلند فطرتی اور غیر معمولی قابلیت و استعداد پر شہادت دیتی ہیں۔ معمولی قابلیت و استعداد کے لوگوں کی معراج یہ ہے کہ جس پک ڈنڈی پر اگلی بھیڑوں کا گلہ چلا جاتا ہے اُسی پر آنکھیں بند کرکے گلے کے پیچھے پیچھے ہولیں؛ اور لیک کے اِدھر اُدھر آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھیں جو ہنر یا پیشہ اختیار کریں اُسمیں اگلوں کی چال ڈھال سے سرِ مو تجاوز

نہ کریں، اور اُنکے نقشِ قدم پر قدم رکھتے چلے جائیں۔ وہ اپنے ارادے اور اختیار سے ایسا نہیں کرتے بلکہ دوسرے رستے پر چلنا اُنکی قدرت سے باہر ہوتا ہے۔

برخلاف اِسکے جنکی طبیعت میں اُرجینیلٹی اور غیر معمولی اُپج کا مادہ ہوتا ہے وہ اپنے میں ایک ایسی چیز پاتے ہیں جو اگلوں کی پیروی پر اُنکو مجبور نہیں ہونے دیتی۔ اُنکو قوم کی شاہ راہ کے سوا بہت سی راہیں ہر طرف کھلی نظر آتی ہیں۔ وہ جس عام روش پر اپنے ہم فنوں کو چلتا دیکھتے ہیں اُسپر چلنے سے اُنکی طبیعت اِبا کرتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ جو طریق غیر مسلوک وہ اختیار کریں وہ منزلِ مقصود تک پہنچانے والا نہو؛ مگر یہ ممکن نہیں کہ جب تک وہ دائیں بائیں چل پھر کر طبیعت کی جولانیاں نہ دیکھ لیں اور تھک کر چور نہو جائیں عام رہگیروں کی طرح آنکھیں بند کرکے شارعِ عام پر پڑ جائیں۔

مرزا کی طبیعت اِسی قسم کی واقع ہوئی تھی وہ عام روش پر چلنے سے ہمیشہ ناک چڑھاتے تھے۔ وہ خست شرکا کے سبب خود شاعری سے نفرت ظاہر کرتے تھے۔ عامیانہ خیالات اور محاورات سے جہاں تک ہوسکتا تھا اجتناب کرتے تھے۔

ایک صاحب نے جو غالباً بنارس یا لکھنؤ سے دلّی میں آئے تھے مرزا کے ایک شعر کی اُنکے سامنے نہایت تعریف کی۔ مرزا نے کہا ارشاد تو ہو وہ کونسا شعر ہے؛ اُنھوں نے میرامانی متخلص بہ اسد شاگرد مرزا رفیع کا یہ شعر پڑھا

"اسد اِس جفا پر بتوں سے وفا کی مرے شیر شاباش رحمت خدا کی"

چونکہ شعر میں اسد تخلص واقع ہوا تھا اُنھوں نے یہ سمجھا کہ مرزا غالب کا شعر ہے۔ مرزا یہ سُنکر بہت جز بز ہوئے اور فرمایا اگر یہ کسی اور اسد کا شعر ہے تو اُسکو رحمت خدا کی اور اگر مجھ اسد کا شعر ہے تو مجھے لعنت خدا کی۔

مرزا کو اس شعر کا اپنی طرف منسوب ہونا غالباً اسلیئے ناگوار گذرا ہوگا کہ مرے شیر اور رحمت خدا کی یہ دونو محاورے زیادہ ترعامیوں اور سوقیوں کی زبان پر جاری ہیں؛ اور اسد کی رعایت سے مرے شیر کہنا یہ بھی اُنکی طبیعت کے خلاف تھا؛ کیونکہ وہ ایسی مبتذل رعایتوں کو جو ہر شخص کو بآسانی سوجھ جائیں۔ مبتذل جانتے تھے۔

اس قسم کی اور بہت سی حکایتیں ہیں جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف شاعری میں بلکہ وضع میں، لباس میں، طعام میں، طریق ماند و بود میں، یہاں تک کہ مرنے اور جینے میں بھی عام طریقے پر چلنا پسند نکرتے تھے۔ یہاں ایک لطیفہ قابل لکھنے کے ہے۔

مرنے سے آٹھ سات برس پہلے اُنھوں نے ایک مادۂ تاریخ اپنی وفات کا نکالا تھا۔ جس میں ۱۲۷۷ھ نکلتے تھے۔ اتفاق سے اُسی سال شہر میں وبا آئی؛ مگر مرزا بچ گئے۔ اِس امر کی نسبت ایک خط میں لکھتے ہیں "میاں ۱۲۷۷ھ کی بات غلط نہ تھی (یعنی اِسی سنہ میں مجھے مرنا چاہئے تھا) مگر میں نے وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا؛ واقعی اِسمیں میری کسرِ شان تھی۔ بعد رفعِ فساد ہوا کے سمجھ لیا جاویگا" اگرچہ یہ محض ایک ہنسی کی بات لکھی ہے؛ مگر اُنکی طبیعت کا اقتضا اِس سے صاف جھلکتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ مخاطب جسکو یہ خط لکھا ہے وہ اُنکی اِس خصلت سے خوب واقف ہے۔

بہرحال مرزا ایک مدت کے بعد اپنی بیراہ روی سے خبردار ہوئے۔ اور استقامتِ طبع اور سلامتیِ ذہن نے اُنکو راہِ راست پر ڈالے بغیر نہ چھوڑا۔ گو اُن کا ابتدائی کلام جسکو وہ حد سے زیادہ جگر کاوی اور دماغ سوزی سے سرانجام کرتے تھے مقبول نہوا؛ مگر۔ چونکہ قوتِ متخیلہ سے

بہت زیادہ کام لیا گیا تھا اور اِس لئے اُسمیں ایک غیر معمولی بلند پروازی پیدا ہوگئی تھی۔ جب قوتِ ممیزہ نے اُسکی باگ اپنے قبضے میں لی تو اُسنے وہ جوہر نکالے جو کسی کے وہم و گمان میں نہ تھے۔

یہاں یہ امر جتا دینا ضرور ہے کہ مرزا نے ریختہ گوئی کو اپنا فن قرار نہیں دیا تھا؛ بلکہ محض تفنّنِ طبع کے طور پر کبھی اپنے دل کی اُپج سے، کبھی دوستوں کی فرمایش سے، اور کبھی بادشاہ یا ولی عہد کے حکم کی تعمیل کے لئے، ایک آدھ غزل لکھ لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُنکے اُردو دیوان میں غزل کے سوا کوئی صنف بقدرِ معتد بہ نہیں پائی جاتی۔ وہ منشی نبی بخش مرحوم کو ایک خط میں لکھتے ہیں "بھائی صاحب تم غزل کی تعریف کرتے ہو؛ اور میں شرماتا ہوں۔ یہ غزلیں کاہیکو ہیں، پیٹ پالنے کی باتیں ہیں۔ میرے فارسی کے وہ قصیدے جن پر مجکو ناز ہے کوئی اُنکا لطف نہیں اُٹھاتا۔ اب قدردانی اِس بات پر منحصر ہے کہ گاہ گاہ حضرتِ ظلِّ سبحانی فرما بیٹھتے ہیں کہ بھئی تم بہت دن سے کوئی سوغات نہیں لائے۔ یعنی نیا ریختہ۔ ناچار کبھی کبھی یہ اتفاق ہوتا ہے کہ کوئی غزل کہکر لیجاتا ہوں"

قطع نظر اِسکے وہ اُس زمانے کے خیالات کے موافق اُردو شاعری کو داخلِ کمالات نہیں سمجھتے تھے؛ بلکہ اُس میں اپنی کسرِ شان جانتے تھے۔ چنانچہ ایک فارسی قطعہ میں جسکی نسبت مشہور ہے کہ اُسمیں شیخ ابراہیم ذوق کی طرف خطاب ہے۔ کہتے ہیں

"فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ   بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بیرنگِ من ست"
"راست میگویم من و از راست سر نتواں کشید   ہرچہ در گفتار فخرِ تست آں ننگِ من ست"

اگرچہ کہ مرزا کے معاصرین اکثر نکتہ سنج اور نکتہ شناس تھے اِس لئے وہ ریختہ کے سرانجام کرنے میں بھی اپنی پوری توجہ اور ہمت صرف کرتے تھے اور دونو زبانوں میں اپنی فوقیت اور برتری قائم رکھنے کی برابر فکر رکھتے تھے۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ شاعر اور اُسکے کلام کے رتبہ کا اندازہ اُسکے کلام کی قلت اور کثرت سے نہیں ہوتا؛ بلکہ اِس بات سے ہوتا ہے کہ اُسکے منتخب اور برگزیدہ اشعار کس درجے کے ہیں۔ میر کی قدر لوگ اِس لئے نہیں کرتے کہ اُسنے متعدد ضخیم دیوان چھوڑے ہیں؛ بلکہ صرف اُسکے منتخب اشعار نے۔ جو تعداد میں نہایت قلیل ہیں۔ اُسکو تمام ریختہ گو شاعروں کا سرتاج بنا دیا ہے۔

لطف علیخاں آذر آتشکدہ میں نوری صفاہانی کی نسبت لکھتا ہے کہ اُسکے دیوان کا مختصر ہونا یہی اُسکے کلام کی خوبی اور حُسنِ طبع کی کافی دلیل ہے۔ یہ بھی معلوم رہے کہ تمام شعرا کا کلام ایک ہی معیار سے نہیں جانچا جاتا؛ ورنہ فردوسی و نظامی دونو مثنوی میں، اور انوری و خاقانی دونو قصیدے میں، مسلّم الثبوت نہیں ٹھہر سکتے۔ کیونکہ انوری کا قصیدہ اور فردوسی کی مثنوی باعتبار سادگی اور صفائی و عام فہم ہونے کے خاقانی کے قصیدے اور نظامی کی مثنوی سے کچھ مناسبت نہیں رکھتے؛ حالانکہ چاروں شخص فارسی شاعری کے رُکنِ رکین مانے جاتے ہیں۔ پس ضرور ہے کہ جدا جدا کلام جدا جدا معیاروں سے جانچے جائیں۔ مرزا کے اُردو کلام میں جیسا کہ اوپر مذکور ہوا غزل کے سوا کوئی صنف شمار کے قابل نہیں ہے۔ مرزا کی موجودہ غزلیات۔ گو بقابلہ بعض شعرا کے تعداد میں کیسی ہی قلیل ہوں۔ لیکن جس قدر منتخب اور برگزیدہ اشعار مرزا کی غزلیات میں موجود ہیں وہ تعداد میں کسی بڑے سے بڑے دیوان کے انتخابی اشعار سے کم نہیں ہیں۔ اور

جس قدر بلند اور عالی خیالات مرزا کے ریختہ میں نکلیں گے اُس قدر کسی ریختہ گو کے کلام میں نکلنے کی توقع نہیں ہے۔ البتہ ہمکو مرزا کے عمدہ اشعار کے جانچنے کے لئے ایک جداگانہ معیار مقرر کرنا پڑیگا۔ جسکو امید ہے کہ اہل انصاف تسلیم کرینگے۔

میر و سودا اور اُنکے مقلدین نے اپنی غزل کی بنیاد اِس بات پر رکھی ہے۔ کہ جو عاشقانہ مضامین صدیوں اور قرنوں سے اوّلاً فارسی اور اُسکے بعد اُردو غزل میں بندھتے چلے آتے ہیں وہی مضامین بہ تبدیلِ الفاظ اور بتغیرِ اسالیب بیان عامۂ اہلِ زبان کی معمولی بول چال اور روزمرہ میں ادا کئے جائیں۔ چنانچہ میر سے لیکر ذوق تک جتنے مشہور غزل گو مرزا کے سوا اہل زبان میں گذرے ہیں اُنکی غزل میں ایسے مضامین بہت ہی کم نکلیں گے جو اِس محدود دائرے سے خارج ہوں۔ اُنکی بڑی کوشش یہ ہوتی تھی کہ جو مضمون پہلے متعدد طور پر بندھ چکا ہے وہی مضمون ایسے بلیغ اسلوب میں ادا کیا جاے کہ تمام اگلی بندشوں سے سبقت لیجائے۔ برخلاف اسکے مرزا نے اپنی غزل کی عمارت دوسری بنیاد پر قائم کی ہے۔ اُنکی غزل میں زیادہ تر ایسے اچھوتے مضامین پائے جاتے ہیں جنکو اور شعرا کی فکر نے بالکل مَس نہیں کیا؛ اور معمولی مضامین ایسے طریقے میں ادا کئے گئے ہیں جو سب سے نرالا ہے؛ اور اُن میں ایسی نزاکتیں رکھی گئی ہیں جن سے اکثر اساتذہ کا کلام خالی معلوم ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اور لوگوں نے اوّل سے آخر تک قوم کی شاہراہ سے سرِ مو انحراف نہیں کیا؛ اور جس چال سے کہ اگلوں نے راہ طے کی تھی اُسی چال سے تمام رستہ طے کیا ہے۔ مرزا نے اول شاہراہ کا رُخ چھوڑکر دوسرے رُخ چلنا اختیار کیا؛ اور جب راہ کی مشکلات نے

مجبور کیا تو ان کو بھی آخر اسی رُخ چلنا پڑا۔ مگر جس لیک پر قافلہ جارہا تھا اُسکے سوا ایک اور لیک اسی کے متوازی اپنے لیے نکالی اور جس چال پر اور لوگ چل رہے تھے اُس چال کو چھوڑ کر دوسری چال اختیار کی چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب میر و سودا اور اُن کے مقلدین کے کلام میں ایک ہی قسم کے خیالات اور مضامین دیکھتے دیکھتے جی اُکتا جاتا ہے اور اُسکے بعد مرزا کے دیوان پر نظر ڈالتے ہیں تو اُسمیں ہمکو ایک دوسرا عالم دکھائی دیتا ہے ؛ اور جس طرح کہ ایک خشکی کا سیاح سمندر کے سفر میں، یا ایک میدان کا رہنے والا پہاڑ پر جاکر، ایک بالکل نئی اور نرالی کیفیت مشاہدہ کرتا ہے ؛ اسی طرح مرزا کے دیوان میں ایک اور ہی سماں نظر آتا ہے۔ یہاں اول ہم چند شعر مرزا کے دیوان سے ایسے نقل کرتے ہیں جن سے اُنکے خیالات کا اچھوتا پن ثابت ہوتا ہے

"بسکہ مشکل ہے ہر اک کام کا آساں ہونا آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا"

بادی النظر میں یہ ایک معمولی بات معلوم ہوتی ہے ؛ مگر غور سے دیکھا جائے تو بالکل اچھوتا خیال ہے دعوےٰ یہ ہے کہ دنیا میں آسان سے آسان کام بھی دشوار ہے۔ اور دلیل یہ ہے کہ آدمی جو کہ عین انسان ہے اُسکا بھی انسان بننا مشکل ہے۔ یہ منطقی استدلال نہیں ہے ؛ بلکہ شاعرانہ استدلال ہے۔ جس سے بہتر ایک شاعر استدلال نہیں کرسکتا۔

"ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا"

نشاط کے معنی اُمنگ کے ہیں۔ نشاطِ کار یعنی کام کرنے کی اُمنگ۔ یہ بھی جہاں تک کہ معلوم ہے ایک نیا خیال ہے ؛ اور نرا خیال ہی نہیں بلکہ فیکٹ ہے ؛ کیونکہ دنیا میں جو کچھ چہل پہل ہے وہ

صرف اِس یقین کی بدولت ہے کہ یہاں رہنے کا زمانہ بہت تھوڑا ہے۔ یہ انسان کی ایک طبیعی خصلت معلوم ہوتی ہے کہ جس قدر فرصت قلیل ہوتی ہے اُسی قدر زیادہ سرگرمی سے کام کو سرانجام کرتا ہے۔ اور جس قدر زیادہ مہلت ملتی ہے اُسی قدر کام میں تاخیر اور سہل انکاری زیادہ کرتا ہے۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ڈبویا مجھکو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

بالکل نئی طرح سے نیستی کو ہستی پر ترجیح دی ہے ؛ اور ایک عجیب توقع پر معدوم محض ہونے کی تمنا کی ہے۔ پہلے مصرع کے معنی ظاہر ہیں۔ دوسرے مصرع سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اگر میں نہ ہوتا تو کیا بُرائی ہوتی ؛ مگر قائل کا مقصود یہ ہے کہ اگر میں نہ ہوتا تو دیکھنا چاہیے کہ مَیں کیا چیز ہوتا ؛ مطلب یہ کہ خدا ہوتا ؛ کیونکہ پہلے مصرع میں بیان ہوچکا ہے کہ اگر کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا۔

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

بالکل نیا اور اچھوتا اور باریک خیال ہے۔ اور نہایت صفائی اور عمدگی سے اُسکو ادا کیا گیا ہے۔ اگر کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو اُسکی فہم کا قصور ہے۔ دعوےٰ یہ ہے کہ جس قدر ہمت عالی ہوتی ہے اُسی کے موافق اُسکی تائید غیب سے ہوتی ہے۔ اور ثبوت یہ ہے کہ قطرۂ اشک جسکو آنکھوں میں جگہ ملی ہے۔ اگر اُسکی ہمت جبکہ وہ دریا میں تھا موتی بننے پر قانع ہوجاتی تو اُسکو۔ جیسا کہ ظاہر ہے یہ درجہ یعنی آنکھوں میں جگہ ملنے کا حاصل نہ ہوتا۔

لاگ ہو تو اُس کو ہم سمجھیں لگاؤ جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

لاگ دشمنی اور لگاؤ محبت۔ یہ مضمون عجب نہیں کہ کسی اور نے بھی باندھا ہو ؛ مگر ہم نے آج تک نہیں دیکھا۔ اگر کسی نے باندھا بھی ہوگا تو اِس خوبی اور لطافت سے ہرگز نہ بندھا ہوگا۔ مطلب